Fikr-o-Nasar (Islamabad) 20:9-10 (1983)

سلطنت اور دین کا تعلق

سید سلیمان ندوی

دُنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں :

ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا، اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو، اور جو خُدا کا ہے، وہ خُدا کو دو[1]۔ اس تعلیم میں قیصر اور خُدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حُکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دُنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خُدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیّت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی، اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دینِ الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا، اور وہ اسلام ہے (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (خُدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیّت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے ان ہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے۔ مگر سلطنتِ الٰہی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔

بادشاہی اسی کی ہے، حُکم اسی کا ہے، فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حُکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اصل دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی

---

[1] انجیل

اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپ کے احکام کی بجاآوری عین احکامِ خُدا کی بجاآوری ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (نساء ۱۱)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے خُدا کی اطاعت کی۔

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپؐ کے جو جانشین اور خلفا ہوئے، اُن میں بھی دین و دُنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور اُن کی سلطنت کے فرماں روا تھے اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور اُن کے احکام کی تعمیل بھی عین خُدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خُدا اور رسول کے حُکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مُسلمان پر واجب التعمیل ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

من اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی [1]

جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اُس نے میرا کہا مانا۔ جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی، اُس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکامِ الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عبادت ہے۔ یہاں تک کہ امرا کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امرا اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو۔ غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خُدا کے لئے اور خُدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسبِ حکمِ الٰہی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عمال کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امرا کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسبِ احکامِ الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے سلاطین اگر اپنی سلطنت اور اُمرا اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاحکام، ج ۲، ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲، ص ۲۲۳ مصر

اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و مؤکدات کی بجا آوری کے بعد اُن کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں۔

حضرت داؤد کا یہ قصہ سورہ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے۔ قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے حالانکہ وہ اُن کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی دادگری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبیہ کیا گیا۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔

(ص ۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) اُن کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا، تو ہم نے اُن کو معاف کر دیا اور اُن کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے۔ اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا یہ فرض ہے کہ حسب احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ما من امام یغلق بابه دون ذوی الحاجة والخلة والمسكنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته و مسكنته

جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کرے گا۔

(ترمذی ابواب الاحکام ۲۲۷)

من ولی من امر المسلمین شیئاً فاحتجب دون خلتهم وحاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عز وجل یوم القیمة دون خلته وفاقته وفقره۔

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد اُن کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

(مستدرک حاکم کتاب الاحکام ج ۴ ص ۹۳ حیدرآباد)

خلفائے راشدینؓ نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انہوں نے اینٹ اور چونے کی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی. اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لئے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں[1] کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگایا. جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہنچی، تو انھوں نے خاص طور سے مدینہ سے محمدؓ بن مسلمہ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہنچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی. حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص نے اُن کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زادِ راہ دینا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینہ واپس چلے آئے (ابن حنبل، ج ۱، ص ۵۴ مصر)

---

[1] چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لئے اذن کا حکم ہے اس لئے خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے مگر عام پبلک مقامات مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

حضرت امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے اُن کو اس حکمِ نبویؐ سے باخبر کیا تو انہوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا کہ جو اہلِ حاجت پہنچے تو اس کی ضرورت سُن کر اُن کو مطلع کر دے (ترمذی ، الباب الاحکام)

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائضِ حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۔ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۔

(نساء - ۸)

امانت والوں کی امانتیں اُن کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو ، خُدا تمہیں بہت خُوب نصیحت کرتا ہے ، بیشک خُدا سُنتا (اور) دیکھتا ہے ، مومنو! خُدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحبِ حکومت ہیں اُن کی بھی ، اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اگر خدا اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس میں خُدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو ، یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مآل بھی اچھا ہے

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں ، جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی ، آیت کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے ، امانت کا اصلی درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا — اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو ،

الْمِيْزَانَ ۔ (رحمٰن ۱) اور میزان میں کمی نہ کرو ۔

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لئے بھی تولو۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۔ (مطففین)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنیوالوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں ۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عدل پرور ہی ہیں ۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (مائدہ، حجرات ۶)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے ۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں ۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے :

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (آل عمران ۶-۱۴)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا،

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (شوریٰ ۴)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ۔

"ظلم" کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں، جس سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۔ (مائدہ ۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں ۔

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے :

الا ایہا الناس لا یقبل اللہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ما انزل اللہ۔	ہاں اے لوگو! جو امام، خدا نے جو قانون اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے

(مستدرک ج ۴ ص ۸۹، کتاب الاحکام) اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرے گا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے، اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے۔ اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت بارگاہِ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرمانروائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضہ سے حسبِ احکامِ الٰہی عہدہ برآ ہوں، ان کے لئے آخرت میں رحمتِ الٰہی کا سایہ ہے اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں اُن کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا :

الامام الذی علی الناس راع ھو مسئول عن رعیتہ (صحیح بخاری ج ۲، ص ۱۰۵۷، کتاب الاحکام)	وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگران کار ہے، اس سے اس کے زیرنگرانی اشخاص کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امارت و خلافت، تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گزر گیا، اس کے لئے دنیا کی سعادت، اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسائش ہے، اور جو اس میں اُلجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ۔ (بخاری و مسلم حوالہ سابق)	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اسکی خیرخواہی پوری پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انھوں نے امیر کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک

پیغام سنا دینا چاہتا ہوں ، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے :

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ الا حرم اللہ علیہ الجنۃ ۔ (مسلم ، کتاب الامارہ)	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے ، وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت و حکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے ، ایک اور صحابی جن کا نام معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے ، وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے ۔ عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے ! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے ۔

ان شر الرعاۃ الحطمۃ ۔ (مسلم ۔ کتاب الامارہ)	سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے ۔

تو ان میں سے نہ بن ۔

اس نے کہا : آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں ۔

فوراً بولے ، کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا ، بھوسی تو اوروں میں تھے ، اور ان کے بعد والے ہیں ۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء فرمایا کرتے تھے ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا ۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا ۔ نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے ، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی ۔

صحابہؓ نے عرض کی : یا رسول اللہ ! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے ؟

فرمایا : پہلے کی بیعت کرو ، پھر اس کے بعد والے کی ، پھر عہد بہ عہد اوروں کی ، ان کا حق ان کو ادا کرو ۔ (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فان اللہ سائلھم عما استرعاھم ۔	کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق

باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس
نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔
(صحیح بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کے امراء کے حق میں یہ دُعا فرمائی ہے :

اللھم من ولی من امر امتی شیئًا
فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی
من امر امتی شیئًا فرفق بھم
فارفق بہ۔
(مُسلم)

اے اللہ! جو کوئی میری اُمّت کی کسی
بات کا (یا حکومت کے کسی حصّہ کا) بھی
والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تُو بھی
اس پر سختی کرنا، اور جو ان سے مہربانی
سے پیش آئے تو تُو بھی اس پر مہربانی فرمانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمّہ داری عائد ہے۔ ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے :

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن
رعیتہ والرجل راع علیٰ اھل
بیتہ وھو مسئول عنھم والمرأۃ
راعیۃ علیٰ بیت بعلھا وولدہ
وھی مسئولۃ عنھم والعبد راع
علیٰ مال سیدہ وھو مسئول عنہ
الا فکلکم راع وکلکم مسئول
عن رعیتہ۔
(مُسلم و صحیح بخاری)

ہاں، تم سب نگران کار ہو، اور تم
سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و
رعایا کی بابت پوچھ ہو گی تو لوگوں کا امیر
نگران کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق
پرسش ہو گی، اور مرد اپنے گھر والوں کا
نگران کار ہے اور اس سے اسکے گھر والوں
کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے
شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگران ہے۔
اس سے ان کے متعلق سوال ہو گا، اور
غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس
سے اس کی بابت پُوچھا جائے گا۔ تو
ہاں، ہشیار رہو، تم سب نگران کار

ہو اور تم سے اس کے زیر نگران کے بابت
باز پرس کی جائے گی ۔

لفظ رعیت

اس موقع پر ایک مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے، جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے، اور وہ رعیت ہے اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہو گئی ہے، حدیثوں میں لفظ "راعی" اور "رعیت" بار بار آئے ہیں۔ یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں۔ "راعی" چرواہا اور "رعیت" وہ جس کو چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت اور پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے اُن کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے اُن کو بچاتا ہے۔ اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُر محبت معنوں میں آیا ہے اور ظالم و سفاک امرا اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں استعمال کر رہے ہیں، حالانکہ اسی لفظ میں اُن کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے۔

ان المقسطین عند اللہ علی منابر من نور عن یمین الرحمٰن وکلتا یدیہ یمین الذین یعدلون فی حکمھم و اھلیھم وما ولوا۔

(صحیح مسلم کتاب الامارہ)

بے شک انصاف کرنے والے (حکام و امرا) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ داہنے ہیں، یہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے۔ جامع ترمذی میں ہے

ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ وادناھم مجلساً امام عادل وابغض الناس الی اللہ وابعدھم منہ مجلسًا امام جائر۔

(ترمذی، ابواب الاحکام)

بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا۔ اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے۔ فرمایا:

مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم الا لم یدخل معھم الجنۃ۔

(صحیح مسلم، کتاب الامارہ)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو، پھر وہ ان کے لئے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

مامن وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ۔

(صحیح بخاری، کتاب الاحکام)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کیساتھ غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت حرام ہے۔

انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ فان امر بتقوی اللہ وعدل فان لہ بذالک اجراً وان امر بغیرہ فان علیہ وزراً۔

(نسائی کتاب البیعۃ)

امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا، اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں۔ اور وہ بھی ثواب، و عذاب، اور جزا و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے

امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولتے ہیں۔ اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں۔ کیونکہ یہاں دین کے معنی احکامِ الٰہی ہیں یا قوانینِ الٰہی ہیں۔ یہ احکام اور قوانین الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں۔ اس بنا پر سلطنت و ولایت اور حکومت و ریاست کے کاروبار کا نظم و نسق اور اہتمام و انصرام بھی دین ہی کا ایک جزء ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ قیامِ سلطنت اور امورِ سلطنت میں داخل و تدبیرِ دنیا کا کام ہے، جس سے اہلِ اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہیئے۔ حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے ؎

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

(اے حافظ! تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور و غل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو اُن سے کیا سروکار)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا کے لئے ہے، اور یہ عین دین ہے۔ اسلام میں جس قتال و جہاد کی دعوت، بر ملا دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ و السلام کی حیاتِ مقدس اور حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضؓ کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں، اس سے مقصود اصلی احکامِ الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضبِ الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدانِ جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے قرآن میں ہے

لے حافظ علیہ الرحمۃ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہیئے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف اُن کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکامِ الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہیئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔

(انفال ۲)

اے اہلِ ایمان! جب میدانِ جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو اُن سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لئے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمتِ عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے ان سے پیٹھ پھیرے گا تو سمجھو کہ) وہ خُدا کے غضب میں گرفتار ہوگیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے۔

وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ۔

(بقرہ ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خُدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ

تو جو لوگ میرے لئے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کئے گئے میں اُن

لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (آلِ عمران ۲۰)

کے گناہ دُور کروں گا اور اُن کو بہشتوں میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خُدا کے ہاں سے بدلہ ہے، اور خُدا کے ہاں اچھا بدلا ہے

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ اُن میں سے ایک معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں۔ سورۂ نُور میں ہے۔

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ۔ (نُور - ۱)

اور اُن دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تُم کو رحم نہ آئے۔

کھلی بات ہے کہ "اللہ کے دین" سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجرا رہے ہے اسی طرح سورۂ بقر کی آیت میں :

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ (بقرہ ۲۳)

اور اُن سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے اور دین سب خُدا کا ہی ہو جائے۔

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے۔ سورۂ انفال کی اس آیت میں :

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (انفال ۴)

اور اُن لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

بھی حکم و قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو "دین" فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے۔ اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (انعام، یوسف)

اَلَا لَهُ الْحُكْمُ (انعام)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے :

وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ

اور اسی خُدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور

الدِّیْنُ وَاصِبًا۔ (نحل ۷) زمین میں ہے۔ اور اسی کی لازمی اطاعت ہے

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے مطابق ہے۔

سلطنت وملکیت کی حقیقت

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت وولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت وسلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زرّیں کمربند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال وجبروت اور قہر وہیبت کی تلواروں کے سائے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ اُن تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیے

سلطنت وحکومت اور ولایت وریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے، قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے۔ مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لئے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لئے الملک ہونے کا استحقاق اسی کو ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ۔	کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں، لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی، لوگوں کے معبودِ برحق کی۔
(الناس ۱)	
اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ۔	بادشاہ حقیقی پاک ذات (ہر عیب سے) امن وامان والا۔
(حشر ۳)	
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے۔

(مومنون ۶)

اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۔ بادشاہ حقیقی ، پاک ذات ، زبردست حکمت والا ۔
(جمعہ ۱)

یہ آیت قرآن پاک میں چھ جگہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو الملک الحق یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے ، یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے ، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت اور اضافت ضرور لگائی گئی ہے ، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس "لوگوں کا پالن ہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو۔ دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا ، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے ۔ تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق (برحق) کی صفت آئی ہے ۔ چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفتیں آئی ہیں ۔ اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے لفظ کے اندر ظلم و سفاکی ، قہر و جبر اور بے رحمی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے ، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے ۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت

عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے ۔ اسلام میں شاہِ شاہاں ، شہنشاہ ، ملک الملوک صرف ایک ہے ، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا :

ان اخنع الاسماء عند اللہ رجل تسمی ملک الاملاک ۔	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے کو شہنشاہ کہے ۔
(صحیح بخاری ، کتاب الادب)	

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر اُن کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے ، اسلام کی زبان میں اپنی طرزِ حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ ،

اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرماں روا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے۔ اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں۔ توراۃ میں یہ بیان صرف حضرت آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا و سزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکام الٰہی کی بجا آوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے۔ پہلی چیز اسلام کے اصلاحی عقاید ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاست کے بنیادی مبادی ہیں [1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۔ (بقرہ ۴)	اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے، جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے اس لئے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر رجوع ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے۔ یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۔
(بنی اسرائیل ۷)

ہم اٹھاتے ہیں اور اُن کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے اُن کو اپنی بہتری مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے :

اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۔ بقرہ - ۴

تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ رہنمائی آئے تو جو میری رہنمائی کی پیروی کریں گے، تو اُن کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے

سورۂ اعراف میں ارشادِ الٰہی ہے :

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ لَمْ يَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ ۔
(اعراف - ۲)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ اُن کی وراثت سے تمام بنی آدمؑ کے حصہ میں آئی۔ اس لیے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی۔

سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے :

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۔ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۔ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔

(انعام - ۲)

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے۔ اور بے شبہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوح کی قوم کا جانشین فرمایا :

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ ۔ (اعراف - ۱۰)

اور یاد کرو جب اللہ نے تم کو نوحؑ کے بعد نیابت بخشی ۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم کو تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ

(ہود - ۵)

تو میرا رب تمہارے علاوہ کسی اور قوم کو خلافت بخشے گا ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے :

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَسْتَخْلِفْ مِّنْۢ بَعْدِكُمْ مَّا یَشَآءُ كَمَآ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ ذُرِّیَّةِ قَوْمٍ اٰخَرِیْنَ ۔

(انعام ۱۶)

اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائے گا اور تمہارے بعد جس کو چاہے خلافت و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے لوگوں کی نسل سے پیدا کیا ۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

اللہ نے تم میں سے اُن سے، جو

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۔ (نور ۷)

ایمان لائے اور اچھے کام کئے، وعدہ کیا کہ اُن کو زمین میں خلافت بخشے گا، جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ۔ (انعام ۲۰)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے جانشین بنایا۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۔ (یونس ۔ ۲)

اور تم سے پہلے ہم کئی اُمتوں کو، جب انھوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے ہیں، اور اُن کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے اُن کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ ۔ (یونس ۔ ۸)

لیکن اُن لوگوں نے ان (نوحؑ) کی تکذیب کی تو ہم نے اُن (نوح) کو اور جو لوگ اُن کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو (طوفان سے) بچا لیا، اور تمہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ کَفَرَ فَعَلَیْہِ کُفْرُہٗ۔ (فاطر ۴)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے

حضرت داؤدؑ کو خلافت بخشی گئی:

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ۔ (ص۔۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَفَ سے مشتق ہے، جس کے معنی "پیچھے کے" ہیں۔ اس لئے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے بظاہر اوجھل ہونے کی صورت میں ہو۔ اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِہِمْ خَلْفٌ (اعراف ۲۱، مریم ۴)

تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے۔ دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

۲۔ وَاخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (اعراف ۱۶)

میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

۳۔ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ۔ (زخرف ۶)

اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ بعض نے کہا

اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خُدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے۔ بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں۔ لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن الغير اما لغيبة المنوب عنه واما لموته واما لعجزه واما لتشريف المستخلف۔ (ص ۵۵ مصر)

خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی موت کے سبب سے ہو، یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو، یا نائب کی نیابت کی عزت بخشنے کے لئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں، جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالےٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحب روح المعانی تک نے ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے، تینوں معنوں کے لئے قول نقل کئے ہیں، اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں۔ میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرّہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے، اسی کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس

فِيهِ۔ (حدید - ۱) میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے ۔

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں کچھ نے کہا کہ ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے۔ کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے، اُس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امورِ خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دُوسرے معنی صحیح ہیں۔ کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے۔ کشاف میں ہے :

ان الاموال التی فی ایدیکم انما هی اموال الله بخلقه وانشائه لها وانما مولكم اياها وخولكم للاستمتاع بها وجعلكم خلفاء فی التصرف فيها۔

وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے، (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالےٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے اسی نے تمہارے تمتع کے لئے اس کا تُم کو مالک بنایا ہے اور تُم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے :

من الاموال التی جعلكم الله خلفاء فی التصرف فيها۔

وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المعانی میں ہے :

جعلكم سبحانه خلفاء عنه عزّ وجلّ فی التصرف فيه من غيران تملكوه حقيقةً

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا، اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرعنوان ہے، یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً۔ (بقرہ-۳۰)	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانیوالا ہوں

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے۔ اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً مِّنِّیْ یَخْلُفُنِیْ فِی الْحُکْمِ بَیْنَ خَلْقِیْ۔	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

انّ اللہ تعالیٰ اخبر الملٰئکۃ انہٗ جاعل فی الارض خلیفۃ لا یحکم فیہا بین خلقہ الا بحکمہ (ص ۱۰۴، مصر)	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ تعالیٰ فی ارضہ وکذالک کل نبی استخلفہم فی عمارۃ الارض و سیاسۃ الناس وتکمیل نفوسہم و تنفیذ امرہ فیہم لاحاجۃ بہ تعالیٰ الیٰ من ینوبہ بل لقصور قبضہ وتلقی امرہ بغیرہ بغیر وسط۔	اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ

سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی
واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں:

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا۔ اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی۔ لیکن جس اہتمام سے، جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش، اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنّت کے داخلہ، پھر اُن کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیا قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کئے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں، بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول مہمد کیا گیا ہے اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی۔ جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا۔ اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے، تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے۔ اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے۔ ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہوجائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں، جن سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل ۷)	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور اُن کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور اُن کو پاک چیزیں روزی کیں اور ہم نے اُن کو اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی ۔

دوسری آیت میں فرمایا :

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۔ (تین ۱)	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لئے بنا ہے ، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں :

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ (جاثیہ ۲)	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں ، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا ، بے شک اس میں ان لوگوں کے لئے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں ۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے ، قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لئے اُن کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے ۔ مزید تشریح کے لئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں :

وَخَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔ (بقرہ ۳)	اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لئے پیدا کیا ۔
وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ ۔ (نحل ۲)	اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا ۔
اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ ۔	اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے ،

(حاشیہ - ۱)

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ ۔ قابو میں کر دیا ۔ اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے

(ابراہیم - ۵) زیر فرمان کر دیا ۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۔ (ابراہیم ۵) اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے۔ اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے ۔ اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے :

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۔

ہم نے (بار) امانت آسمانوں، اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا ۔

(احزاب - ۹)

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے۔ یہ امانتِ الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں، اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لئے عاریۃً ملے ہیں۔ یہ حدیث کہ فانّ اللہ خلق آدم علی صورتہٖ (اللہ نے آدمؑ کو اپنی صورت میں پیدا کیا) اسی معنی کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور مشہور قول تخلّقوا باخلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے ۔

اس تفصیل سے واضح ہو گا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے۔ جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہنچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں ۔

اب اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی زندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالٰے نے انسان کی پیدائیش کی غرض بتادی ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ -	مَیں نے انسان اور جنّ کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں -

اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے اس کے ہاتھ میں شریعتِ الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجا لانا اور ساری دُنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔ وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اُس کے حکم کا بندہ ہے -